۳۱

الٰہی جماعتیں دین پر عمل کر کے ہی کامیابی حاصل کر سکتی ہیں

(فرمودہ ۱۶؍ستمبر ۱۹۳۸ء)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور نے حسب ذیل آیات تلاوت فرمائیں:

''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ افْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۸﴾ وَ جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَ فِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَ فِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۷۹﴾[1]

اس کے بعد فرمایا:-

''یہ آیتیں جو میں نے اِس وقت تلاوت کی ہیں مومنوں کو اُن کے ان فرائض کی طرف توجہ دلاتی ہیں جو الٰہی جماعتوں کو کامیاب بنانے میں مُمِد ہوتے ہیں اور جن کے بغیر غلبے کا حصول بالکل ناممکن ہوتا ہے۔ دُنیوی جماعتوں کا طریقِ کار بالکل علیحدہ ہوتا ہے ان پر دینی جماعتوں کا قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دُنیوی جماعتوں کا دارومدار خالص طور پر ان کی اپنی سعی اور کوشش پر ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس کے لئے اُن کے لئے کوئی ضروری نہیں ہوتا کہ وہ سچ سے کام لیں۔

وہ جھوٹ ، فریب اور دغا بازی، ان سارے ہتھیاروں کو استعمال کر سکتے ہیں مگر یہ ہتھیار جو عام طور پر دُنیا میں کامیابی کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں دین میں اِن کو بالکل حرام قرار دیا گیا ہے۔ دُنیوی اُمور میں لوگ جھوٹ سے کام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جھوٹ کے بغیر گزارہ نہیں ، وہ فریب سے کام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فریب کے بغیر گزارہ نہیں ، وہ منافقت سے کام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کے منافقت کے بغیر گزارہ نہیں ۔ جب ایک قوم دوسری قوم کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے، جب اس کی ساری قوتیں دوسری قوم پر حملہ کرنے کے لیے مجتمع ہو رہی ہوتی ہیں ، جب اس کے سارے محکمے اپنے کیل کانٹے درست کر رہے ہوتے ہیں اس وقت دنیا دار حکومتیں بڑے زور سے یہ اعلان کرتی سُنائی دیتی ہیں کہ ہمارے تعلقات اس حکومت سے بڑے اچھے ہیں اور جب وہ جنگ کا فیصلہ کر چکی ہوتی ہیں اُن کے مدبّر بڑے زور شور سے یہ اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم صلح کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کریں گے مگر اُن کی غرض اِن اعلانات سے یہ ہوتی ہے کہ اگر ہمارا دُشمن بیوقوف بنایا جا سکے تو اسے بیوقوف بنائیں ۔اس کے مقابلہ میں ان کا دُشمن بھی اسی طرح کر رہا ہوتا ہے جس طرح وہ کر رہے ہوتے ہیں ۔ وہ بھی دھوکا اور فریب اور جھوٹ استعمال کر رہا ہوتا ہے مگر دین کے ساتھ تعلق رکھنے والی قوموں کو اس قسم کے طریق اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوتی ۔انہیں اگر کہا جاتا ہے تو یہ کہ تمہیں اچانک حملہ کرنے کی اجازت نہیں اور اگر تمہارا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہے اور تم دیکھتے ہو کہ دوسرا فریق اس معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو ایک لمبا عرصہ قبل یہ اعلان کر دو کہ ہمارا تمہارا معاہدہ ختم ہے ۔اس کے بعد اگر تم چاہو تو دوسری قوم سے لڑ سکتے ہو۔

پس دینی کاموں کے لیے مشکلات بہت زیادہ ہوتی ہیں کیونکہ جن تدابیر کو دُنیا اختیار کر سکتی ہے ان کو ان تدابیر کے اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوتی ۔اس لئے کوئی ایسا قائمقام ہونا چاہیئے جو جھوٹ اور فریب اور دغا کے مقابلہ میں نیکی کا سہارا ہو۔اس سہارے کا اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں جو ابھی مَیں نے تلاوت کی ہیں ذکر کیا ہے فرماتا ہے **يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا** ۔اے مومنو! تم رکوع کرو اور رکوع سے مراد اس جگہ نماز والا رکوع نہیں بلکہ رکوع کے معنی نماز کے علاوہ بھی ایک ہوتے ہیں اور وہ معنی یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کی توحید پر کامل ایمان

رکھتے ہوئے اس کی طرف جھک جانا اور ما سویٰ اللہ کا خیال اپنے دل سے بکلی نکال دینا۔ گویا کامل توحید کے خیالات دل میں پیدا کر لینا اور ما سویٰ اللہ کی عبادت، اس پر انحصار، توکّل اور امید کا دل سے نکال دینا۔ اس کا نام عربی زبان میں رکوع ہے۔ چنانچہ عربی کا محاورہ ہے کہ فُلَانٌ رَکَعَ اِلَی اللہِ ۔ کہ فلاں شخص ہر ایک دُنیوی چیز کا خیال اپنے دل سے نکال کر خدا تعالیٰ کی طرف جُھک گیا۔ پس اس جگہ رکوع سے مراد وہ رکوع نہیں جو نماز میں کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ رکوع ہم علیحدہ نہیں کرتے بلکہ نماز کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ خالی رکوع اسلام میں کہیں ثابت نہیں اور خالی سجدہ اسلام میں شکریہ یا تلاوتِ قرآن کریم کے سوا عبادت کے طور پر ثابت نہیں ہے بلکہ خالی سجدہ دُعا کے موقع پر کر بھی لیا جاتا ہے۔ خالی رکوع کا رسماً بھی اسلام میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ پس رکوع سے مراد یہاں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھک جانا نہیں بلکہ ما سویٰ اللہ کا خیال اپنے دل سے نکال کر کامل توحید پر ایمان رکھتے ہوئے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کا نام رکوع ہے یہ گویا قائمقام ہو جاتا ہے مومن کے لیے ان چیزوں کا جن کو چھوڑنے کا اسے حکم ہے۔ رکوع کا لفظ اصل میں اسی لئے استعمال کیا گیا ہے کہ رکوع میں ایک چیز ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور سہارا ہمیشہ ٹیڑھا ہو کر لیا جاتا ہے۔ جو شخص سیدھا کھڑا ہوگا وہ سہارا نہیں لے سکتا اور اگر وہ سہارا لینا چاہے گا تو اسی وقت لے سکے گا جب وہ ٹیڑھا ہوگا تو وَّ ارْكَعُوْا کے معنی دراصل خدا تعالیٰ پر سہارا لینا اور اس کے اوپر جُھک جانا ہے۔ جھوٹ، فریب اور منافقت یہ دُنیا کے سہارے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ تو بڑے گندے سہارے ہیں، ان کو چھوڑ و اور ان کے قریب بھی مت پھٹکو۔ جب دنیا کے سہارے ایک انسان سے لے لئے جائیں تو لازماً وہ کسی اور سہارے کا محتاج ہوگا کیونکہ انسان سخت کمزور اور بے بس ہے۔ ایک کمزور انسان جو بیمار بھی ہو کرچز (CRUTCHES) پر چلتا ہے یا کھڑا ہوتا ہے تو دیوار کی ٹیک لگا لیتا ہے یا دَم لینے کے لئے کرسی پر جا بیٹھتا ہے یا اگر لیٹے لیٹے سر اُٹھاتا ہے تو کُہنی کا سہارا لے لیتا ہے یا گاؤ تکیہ اپنے پیچھے رکھ لیتا ہے تو کمزوری اور بیماری کے وقت انسان کو دوسری چیزوں کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ انسان روحانی عالَم میں سخت کمزور ہے اور ہزاروں خفیہ باتیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو اس کی ترقی کی راہ میں روک بن کر حائل ہو جاتی ہیں اس لئے اس عالم میں بھی وہ کسی نہ کسی سہارے کا محتاج ہوتا ہے۔

دُنیا دار شخص ایسے موقع پر دغا، فریب، جھوٹ اور مکاری کا سہارا لے لیتا ہے مگر مومن کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم ان امور سے بچو۔ تم نہ فریب سے کام لو، نہ جھوٹ سے کام لو، نہ دھوکا سے کام لو اور نہ اَور کسی ناجائز ہتھیار کو استعمال کرو۔ اب جبکہ ایک کمزور انسان کے تمام دُنیوی سہارے شریعت نے لے لئے تو سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ کیا کرے؟ سہارا تو ایک کمزور انسان کے لئے ضروری تھا اور اس سے سہارے کو لے لینا ایسا ہی ہے جیسے ایک لُنجے کی سوٹیاں لے لی جائیں یا بیمار کے نیچے سے گاؤ تکیہ نکال لیا جائے یا ایک کمزور انسان جب کرسی پر بیٹھنے لگے تو اس کے نیچے سے کرسی نکال لی جائے۔ ایسی حالت میں اسے لازماً کسی اَور سہارے کی ضرورت پیش آئے گی اور وہ کہے گا مَیں کس پر سہارا لوں، میں تو گر جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس کا جواب دیا ہے۔ فرمایا ہے **اِرْکَعُوْا** تم ہمارے اوپر سہارا لے لو اور ہم پر جُھک جاؤ یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی انسان دوسرے کمزور انسان کی سوٹی تو لے لے مگر اپنا کندھا اس کے سامنے پیش کر دے اور کہے کہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلو۔ اسی طرح جب اَور ناجائز ہتھیاروں اور ناجائز سہاروں سے اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا تو فرمایا چونکہ تمہیں کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت ہے اس لیے ہم تمہیں کہتے ہیں تم ہم پر جُھک جاؤ اور ہمارا سہارا لے لو۔ تو **اِرْکَعُوْا** کا لفظ تَوَکُّل عَلَی اللہ پر دلالت کرتا ہے اور اس میں یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ مومن کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرنا اور سمجھ لینا چاہئے کہ میرے کاموں میں جو نقص ہے خدا تعالیٰ اس کا خود ذمہ دار ہے کیونکہ جب کامیابی کے حصول کی دُنیوی تدابیر سے اس نے منع کر دیا تو اب وہ ہمارا خود ذمہ دار ہے اور وہ آپ ہمارے نقصوں اور ہماری خامیوں کو پورا کرے گا۔ پھر فرماتا ہے **وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ** یہاں **وَ اسْجُدُوْا** میں جو سجدہ کا لفظ آتا ہے اس سے مراد بھی نماز والا سجدہ نہیں ہے اس لئے کہ آگے **وَ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ** کے الفاظ آتے ہیں جس میں سجدہ بھی شامل ہے۔ پس اس جگہ سجدہ سے مراد بھی وہ سجدہ نہیں جو ہم زمین پر کرتے ہیں بلکہ **وَ اسْجُدُوْا** کے معنی ہیں۔ اے مومنو! تم کامل فرمانبرداری سے کام لو اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پوری اتباع کرو اور جس طرح وہ حُکم دیتا ہے اسی طرح کرو۔ چاہے وہ حُکم تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ بسا اوقات انسان ایک چیز کے متعلق جانتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے پیش کی گئی ہے مگر اپنی نادانی سے

سمجھتا ہے کہ اس میں میری تباہی اور بربادی ہے لیکن جب وہ خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے اس چیز کو اختیار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی خود حفاظت کرتا اور بجائے اس کے کہ وہ تباہ ہو اس پر انعامات کا نزول شروع ہو جاتا ہے۔ حدیثوں میں اس کی ایک نہایت ہی لطیف مثال بیان کی گئی ہے کہ کس طرح وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے لئے تکلیفیں اُٹھاتے اور بظاہر اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھوں میں گراتے چلے جاتے ہیں انجام کار اللہ تعالیٰ کے فضلوں کے وارث بن جاتے اور تباہی کے سامانوں میں ان کے لئے برکت کے سامان پیدا کر دئے جاتے ہیں۔

حدیثوں میں آتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے ایک بندے سے کہے گا کہ دوزخ میں کُود، بندہ بے دھڑک دوزخ میں کُود جائے گا اور کہے گا کہ جب مجھے میرے ربّ کا یہی حُکم ہے کہ مَیں دوزخ میں کُود جاؤں تو مجھے دوزخ ہی منظور ہے مگر جب وہ اس میں کُود ے گا تو دوزخ اس کے لیے نہایت آرام دہ جنت بن جائے گی اور وہ آگ سے کھیلنے لگ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس پر کہے گا دیکھو میرا بندہ آگ سے کیسا خوش ہو رہا ہے۔[۲] یہ مثال درحقیقت اسی بات کی ہے کہ وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے دین کے لئے قُربانی کر کے بظاہر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اللہ تعالی انہی ہلاکت کے سامانوں میں ان کے لئے ترقی کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ بظاہر دُنیا سمجھتی ہے کہ وہ آگ میں کُود ے ہیں مگر جب وہ اس آگ میں کُود جاتے ہیں تو وہی آگ ان کے لئے جنت بن جاتی ہے۔

صحابہؓ کو دیکھیں اُنہوں نے کیسی خطرناک آگ اپنے لئے قبول کی مگر وہی آگ ان کے لئے کیسی جنت بن گئی کہ دُنیا پر اس زمانے سے لے کر آج تک تیرہ سَو سال گزر چکے اور نا معلوم ابھی کتنے سَو سال یا کتنے ہزار سال یا کتنے لاکھ سال یا کتنے کروڑ سال یا کتنے ارب سال اَور گزرنے ہیں، اللہ تعالیٰ ہی اس کو بہتر جانتا ہے مگر آج بھی جب صحابہؓ کا کوئی ذکر کرتا ہے تو ایک مخلص کا دل محبت سے بھر جاتا ہے اور وہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ[۳] کہے بغیر نہیں رہتا اور قیامت تک ایسا ہی ہوتا چلا جائے گا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں دُنیا میں لوگ نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے بڑی بڑی قُربانیاں کرتے ہیں۔ بعض آدمیوں کو مَیں نے دیکھا ہے ان کی ساری عمر ''خان صاحب'' کے خطاب کے حصول کے لئے ہی گزر جاتی ہے۔ حالانکہ ''خان صاحب''

کے خطاب میں کیا رکھا ہے؟ دو لفظ ہی ہیں ورنہ ان کی کیا حقیقت ہے؟ پھر ان کا یہ اپنا اختیار ہوتا ہے کہ وہ اگر چاہیں تو اپنا نام ''خان صاحب'' رکھ لیں۔ چنانچہ کئی لوگ اپنے بچوں کا نام ''خان صاحب'' یا ''خان بہادر'' رکھ دیتے ہیں۔

پس اگر وہ چاہیں تو یہ نام آپ بھی اپنا رکھ سکتے ہیں مگر اس لئے کہ گورنمنٹ کی طرف سے ان کو یہ نام ملے وہ اپنی ساری عمر اسی کوشش میں گزار دیتے اور اس کے لئے بڑی بڑی غلامیاں کرتے ہیں، کہیں انہیں جھوٹ بولنا پڑتا ہے، کہیں فریب سے کام لینا پڑتا ہے، کہیں عیّاری اور مکاری کرنی پڑتی ہے، کہیں قوم کو قُربان کرتے ہیں اور اس تمام مکر وفریب اور تمام چاپلوسی غلامی اور لجاجت میں ایک ہی بات اُن کے مدِّ نظر ہوتی ہے کہ کسی دن صاحب بہادر خوش ہوجائے تو وہ ہمارے متعلق خان صاحب یا خان بہادر کے خطاب کی سفارش کر دے۔ اگر انسانی فطرت کی اس کمزوری کا خیال نہ رکھا جائے تو ایسے انسان کا تصور کر کے ہی شرم سے انسان پانی پانی ہو جاتا ہے اور وہ حیران ہوتا ہے کہ ان الفاظ میں آخر رکھا ہی کیا ہے اور خان صاحب یا خان بہادر کا خطاب ملنے سے ہو کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے لئے اتنی جدوجہد کرتا ہے سوائے اس کے کہ اُسے افسروں کو سلام کرنے پڑتے ہیں اور دربار میں اسے جُھکنا پڑتا ہے اور اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور ان عزتوں سے تو شریف آدمی بعض دفعہ بڑے گھبراتے ہیں۔

ہمارے ہی عزیزوں میں سے ایک کٹر دُنیا دار تھے وہ احمدی نہیں تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ کوشش کی اور وہ سفید پوش ہو گئے۔ اس زمانے میں ڈاک کے متعلق سرکاری انتظام چونکہ ابھی اعلیٰ پیمانہ پر نہیں تھا اس لئے جو ذیلدار یا سفید پوش ہوتے، انہیں بعض دفعہ ضروری چِٹھیاں بھیجی جاتی تھیں کہ وہ ڈپٹی کمشنر کو پہنچا آئیں۔ اتفاق ایسا ہوُا کہ اِدھر وہ کوشش کر کے سفید پوش بنے اور اُدھر ایک سرکاری آفیسر نے اُنہیں بُلایا اور کہا کہ ڈپٹی کمشنر آجکل دورہ پر ہے اور فلاں جگہ ہے، ایک اہم سرکاری پروانہ لیفٹیننٹ گورنر صاحب کی طرف سے آیا ہے، آپ یہ جا کر اُنہیں پہنچا دیں۔ وہ تو خیر حُکمِ حاکم مرگِ مفاجات اُنہوں نے جوں توں کر کے پہنچا دیا مگر گھر واپس آتے ہی استعفیٰ دے دیا اور کہا مجھے سفید پوشی منظور نہیں۔ مَیں سفید پوشی عزت کی چیز سمجھا تھا

مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ سفید پوشی انسان کو ہرکارہ بناتی ہے۔مگر دنیا میں کتنے ہی لوگ ہیں جو اس کے لئے ہر قسم کی تکلیف گوارہ کرتے اور خواہش رکھتے ہیں کہ کسی طرح وہ ذیلدار یا سفید پوش بن جائیں۔

قادیان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔دُنیا جہان سے الگ ایک کونہ میں واقع ہے ساری دُنیا ہماری دشمن ہے۔قادیان کا نام سُن کر مخالف لوگ کوسوں بھاگتے ہیں۔مگر میں نے دیکھا ہے جہاں کوئی احمدی افسر ہوتا ہے وہاں کے بڑے بڑے زمیندار جو بعض دفعہ چار چار، پانچ پانچ، چھ چھ یا دس دس ہزار ایکڑ زمین کے مالک ہوتے ہیں۔باوجود مخالفت کے ہمارے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں فلاں احمدی افسر کو ہمارے متعلق کوئی چِٹھی لکھ دیں کیونکہ ہمارا اُن کے پاس سفید پوشی یا ذیلداری کا مقدمہ ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ سفید پوشی یا ذیلداری ہمیں مِل جائے۔مَیں جب ان کو دیکھتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو گھر بیٹھے دولت وثروت دی تھی اور یہ باپ دادا سے ہزاروں ایکڑ زمین کے مالک چلے آتے تھے اگر یہ ولایت میں ہوتے تو لارڈ اور ڈیوک اور مارکوئیس اور ارل اور کیا کیا ہوتے مگر یہ سفید پوشی یا ذیلداری کے لئے مارے مارے پھر رہے ہیں۔یوں شاید وہ مذہبی تعصب کی بناء پر ہم سے بات کرنا بھی اپنی ہتک سمجھیں مگر سفارش کرانے کے لئے ہمارے پاس آموجود ہوتے ہیں۔تو ان کی حالت دیکھ کر مجھے نہایت ہی تعجب آتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ الٰہی یہ کیسی ذلت کو پہنچ گئے ہیں؟ اگر یہ اسی عزت پر قناعت کرتے جو خدا تعالیٰ نے ان کو دی تھی تو ذیلدار یا سفید پوش ہونے کی جدوجہد میں انہیں کئی قسم کی ذلتیں برداشت نہ کرنا پڑتیں۔حقیقت یہ ہے کہ وہ شخص جو اپنی عزت پر قناعت کرتا ہے اس کی ساری دنیا عزت کرتی ہے اور عزت تو اپنے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ دُنیاداروں میں سے بھی جو شریف لوگ ہوتے ہیں چاہے دین ان میں نہ ہو وہ اپنی عزت کے متعلق غیرت رکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی ان کی عزت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ہمارے دادا صاحب کی نسبت حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ بڑے دُنیادار تھے اور ہمیشہ دُنیا کے خیالات میں منہمک رہتے لیکن شرافتِ خاندانی کی حِس اُن میں اس قدر تھی کہ پُرانے لوگوں سے میں نے سُنا ہے کہ وہ ایک دفعہ کمشنر سے ملنے

کے لئے گئے۔ دورانِ گفتگو میں کمشنر پوچھ بیٹھا کہ مَیں دورہ پر جانے والا ہوں یہ بتائیں کہ قادیان سے سری گوبند پور کتنے میل ہے؟ اُس نے جونہی یہ سوال کیا ہمارے دادا صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے مَیں اپنی ہتک کرانے کے لئے یہاں نہیں آیا مَیں کوئی ہر کارہ نہیں کہ ایسا سوال مجھ سے کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ کمشنر اُن کی منتیں کرنے لگا اور کہنے لگا آپ ناراض نہ ہوں مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔[۴] وہ دُنیا دار تھے مگر یہ حِس اُن میں بھی تھی کہ مَیں عزت رکھتا ہوں اور اگر تم میری عزت کا پاس نہیں کر سکتے تو مَیں جاتا ہوں۔ تو انسان کی حقیقی عزت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے ملتی ہے۔ وہ عزت جتنی بھی ہو خواہ تھوڑی ہو یا بہت انسان کے لئے کافی ہوتی ہے مگر جب وہ خیالی عزتوں کے پیچھے پڑتا ہے تو اسے ایسی ایسی غلامیاں اور ایسی ایسی فرمانبرداریاں کرنی پڑتی ہیں کہ جن کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی اور پھر اسے جو چیز ملتی ہے وہ نہایت ہی حقیر ہوتی ہے۔

ہمارے صوفیاء کی تاریخ میں ایک مشہور واقعہ آتا ہے۔ شبلیؒ اسلام میں ایک بہت بڑے بزرگ اور ولی اللہ گزرے ہیں۔ ان کا نام اتنا مشہور ہے کہ گاؤں کے لوگ بھی انہیں جانتے ہیں اور اشعار میں اُن کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ اسلام میں چوٹی کے بزرگ ہوئے ہیں۔ وہ اسلامی بادشاہت میں پہلے گورنر تھے اور اس قدر ظالم اور جابر تھے کہ حجاج بن یوسف کی طرح ان کا بھی رُعب تھا اور لوگ اُن سے بڑے ڈرتے تھے۔ ذرہ سی بات پر بھی لوگوں کو سخت سزائیں دیتے اور انہیں مارتے یا قتل کرا دیتے۔ ایک دن بغداد میں بادشاہ کا دربار لگا ہؤا تھا وہ بھی اس دربار میں موجود تھے کہ ایک فاتح جرنیل بادشاہ کے سامنے پیش ہؤا۔ اس جرنیل نے بعض مخالف افواج کو جن سے باشاہ بھی گھبراتا تھا شکست فاش دی تھی اور بادشاہ نے یہ دربار اسی لئے لگایا تھا کہ اپنے ہاتھ سے اس جرنیل کو خلعتِ فاخرہ دے اور اس طرح سب کے سامنے اس کی قدر افزائی کرے۔ چنانچہ وہ بادشاہ کے سامنے پیش ہؤا اور اُس نے نہایت ہی اعزاز کے ساتھ اسے خلعت پہنایا مگر وہ بیچارہ شاید اس دن شامتِ اعمال سے رومال لانا بھول گیا تھا۔ عام طور پر درباری اپنی آستینوں میں رومال چھپا کر رکھتے ہیں یا ممکن ہے وہ رومال تو لایا ہو مگر اس کے پہلے کوٹ میں ہو جو اُس نے خلعت پہننے کے لئے اُتارا ہو۔ بہرحال اُس وقت رومال اس کے پاس

نہیں تھا جب وہ خلعت پہن چُکا تو اتفاقاً اُسے چھینک آئی جس سے اُس کا ناک بہہ پڑا۔ شاید اُسے نزلہ کی شکایت تھی۔ یہ دیکھ کر وہ سخت گھبرایا اور اُس نے بادشاہ کی بے ادبی کے ڈر سے جیب پر ہاتھ جو مارا تو دیکھا کہ رومال نہیں۔ اسے اور زیادہ فکر لاحق ہوا اور اب وہ سوچنے لگا کہ کیا کروں؟ آخر اس مصیبت سے بچنے کے لئے اُس نے ایک طرف منہ کر کے اسی خلعت کے ایک کونہ سے اپنا ناک پونچھ لیا۔ اتفاقاً بادشاہ کی بھی اُس پر نظر پڑ گئی۔ بس یہ دیکھتے ہی اسے قہر آ گیا۔ بادشاہ نے بے تحاشہ اُسے گالیاں دینی شروع کر دیں کہ بڑے بے حیا اور کمینہ ہو، ہم نے تمہاری عزت افزائی کی اور تم نے ہمارے خلعت کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اس سے اپنا ناک پونچھ لیا۔ پھر اُس نے حُکم دیا کہ اس کا خلعت اُتار لیا جائے، اس سے تمام عہدے چھین لئے جائیں اور اسے ذلیل کر کے دربار میں سے نکال دیا جائے۔ اِدھر بادشاہ نے یہ حُکم دیا اور اُدھر شبلی رونے لگ گئے اور روتے ہی چلے گئے۔ بادشاہ نے اُن کی طرف دیکھا اور کہا شبلی تمہیں کیا ہو گیا؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو جو روتے ہو؟ شبلی کہنے لگے حضور میرا استعفیٰ منظور کیجئے۔ وہ کہنے لگا کیوں؟ معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کے دل میں کوئی نیکی اور تقویٰ تھا جو اُن کے کام آ گیا اور وہ کہنے لگے حضور! آپ نے اس جرنیل کو خلعت دیا اور اس کی عزت افزائی فرمائی مگر یہ خلعت اس کی قُربانیوں کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھتا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ سال دو سال آپ کے دشمن کے مقابلہ میں برسرِ پیکار رہا۔ وہ ہر روز اپنی بیوی کو بیوہ اور اپنے بچوں کو یتیم بنا دینے کے ارادہ سے نکلتا اور گھمسان کی لڑائیوں میں آپ کی عزت اور آپ کی حکومت کی وسعت کے لئے گُھس جاتا۔ ہر روز اس کی جان خطرے میں تھی، ہر روز اس پر ایک موت آتی تھی۔ کوئی دن نہ تھا جس میں وہ آپ کی عزت کے لئے اپنی بیوی کو بیوہ اور اپنے بچوں کو یتیم بنانے کا تہیہ نہ کرتا مگر اتنی بڑی قربانیوں کے بعد آپ نے اسے جو خلعت دیا وہ گو اُس کی قُربانیوں کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا مگر آپ نے اتنا بھی گوارہ نہ کیا کہ اس نے آپ کے عطا کردہ خلعت سے ناک کیوں پونچھ لیا اور آپ نے اسے اپنے خلعت کی بے حرمتی قرار دیا۔ حضور اس سے بہت زیادہ قیمتی خلعت وہ ہے جو خدا نے مجھے دیا ہوا ہے۔ یہ ناک، یہ کان، یہ منہ، یہ آنکھیں، یہ زبان یہ ہاتھ، یہ پاؤں، یہ دماغ، یہ اعضاء اور یہ تمام طاقتیں اللہ تعالیٰ کا خلعت ہیں۔ مَیں آپ کی خاطر

ایک لمبے عرصہ سے اللہ تعالیٰ کے اس خلعت کو خراب کر رہا ہوں۔ مَیں ڈرتا ہوں کہ قیامت کے دن جب میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوں گا تو اُس کو کیا جواب دوں گا اور اپنی براءت میں کونسی بات پیش کرسکوں گا؟ پس میرا استعفیٰ منظور کیجئے مَیں اب اَور زیادہ اس الٰہی خلعت کی بے حرمتی کرنا نہیں چاہتا۔ بادشاہ نے اُنہیں بہتیرا سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور استعفیٰ دے کر الگ ہوگئے، وہ اتنے ظالم مشہور تھے کہ اس کے بعد وہ مختلف علماء کے پاس جب توبہ کے لئے گئے تو کوئی اُن کی توبہ قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا اور ہر ایک کہتا کہ تیرے جیسے آدمی کو تو اللہ تعالیٰ سیدھا جہنم میں جھونکے گا۔ آخر وہ حضرت جنید بغدادی کے پاس گئے اور جا کر کہنے لگے کہ چاہے کوئی شرط آپ رکھیں مَیں ہر شرط ماننے کے لئے تیار ہوں میری بیعت آپ قبول فرمائیں۔ وہ کہنے لگے اچھا اگر تمہیں ہر شرط منظور ہے تو پھر تم اس شہر میں جاؤ جہاں کے تم گورنر رہ چکے ہو اور اس شہر کے ہر گھر کے دروازہ پر دستک دو اور وہاں کے لوگوں سے معافی مانگو۔ چاہے معافی مانگنے میں تمہیں کتنا عرصہ لگ جائے۔ چنانچہ وہ اُس شہر میں گئے اور چھ مہینے یا سال یا جتنا عرصہ لگا وہ اس شہر میں رہے اور اُنہوں نے ہر دروازہ پر دستک دے کر لوگوں سے اپنے گناہوں کی معافی چاہی اور جب سب سے معافی مانگ چکے تو پھر حضرت جنید کے پاس آئے اور اُنہوں نے اپنی بیعت میں انہیں شامل کر لیا۔[5] اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُنہیں خود بھی بہت بڑا رُتبہ دے دیا چنانچہ وہ اسلام کے صوفیاء کے ایک ستون سمجھے جاتے ہیں۔

تو انسان چھوٹی چھوٹی عزتوں کے حصول کے لئے بڑی بڑی قُربانیاں کرتا ہے اور پھر ان قُربانیوں کے بعد جو چیز اسے ملتی ہے وہ نہایت ہی ذلیل اور ادنیٰ قسم کی ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل اتنے اہم ہوتے ہیں کہ ان فضلوں کے مقابلہ میں دُنیا کی بادشاہتیں بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ جیسے مَیں نے بتایا ہے کہ صحابہ کا جب بھی کوئی ذکر کرے ہم رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ کہے بغیر نہیں رہتے۔ اب یہ ایک خطاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دیا۔ ایسا ہی جیسا خان صاحب یا خان بہادر یا سر یا ڈیوک یا مارکوئس یا ارل وغیرہ ہیں۔ مگر سوچو تو سہی کتنے خان بہادر یا سر یا ڈیوک یا مارکوئس یا ارل ہیں جن کا نام دُنیا جانتی ہے یا کتنے بادشاہ ہیں جن کا نام لوگ جانتے ہیں یا کتنے بادشاہ ہیں جن کا نام دُنیا خطاب سمیت لیتی ہے۔

بڑے بڑے بادشاہ دُنیا میں گزرے ہیں مگر آج لوگ اُن کا نام نہایت بے پروائی سے لے دیتے ہیں۔

سکندر کتنا بڑا بادشاہ تھا یونان سے وہ چلتا ہے اور ہندوستان تک فتح کرتا چلا آتا ہے اور بڑی زبردست حکومتوں کو راستہ میں شکست دیتا ہے مگر آج ایک غریب اور معمولی مزدور بھی جو ایک انگریز سپاہی سے بھی ڈر جاتا ہے سکندر کا نام نہایت بے پروائی سے لے لیتا ہے۔ بچے بھی سکندر سکندر کہتے پھرتے ہیں اور کوئی ادب کا لفظ اس کے لئے استعمال نہیں کرتے۔

دارا[6] بھی ایک عظیم الشان بادشاہ تھا اور گو اُسے سکندر کے مقابلہ میں شکست ہوئی مگر اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ وہ بھی زبردست سلطنت کا مالک تھا اور چین تک اس کی حکومت پھیلی ہوئی تھی مگر آج لوگ اُسے دارا دارا کہتے پھرتے ہیں۔ بادشاہ کا لفظ بھی اس کے متعلق استعمال نہیں کرتے۔

تیمور جو ایک زمانہ میں دنیا کے لئے قیامت بن گیا تھا۔ آج اُسے ساری دنیا تیمور لنگ یعنی لنگڑا تیمور کہتی ہے۔ اپنے زمانہ میں اُس کی اتنی ہیبت تھی کہ جب وہ حملہ کرتا تو کُشتوں کے پشتے لگا دیتا اور بعض جگہ تو لوگوں کو مار مار کر اُن کی لاشوں کو جمع کرتا اور ایک مینار کھڑا کر دیتا۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ اس نے کئی لاکھ آدمی قتل کیا ہے مگر اب ایک ذلیل سے ذلیل انسان بھی جب تیمور کا ذکر کرتا ہے تو کہتا ہے لنگڑا تیمور۔ حالانکہ اس کے زمانہ میں کسی کو یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ اُسے لنگڑا تیمور کہے بلکہ بادشاہ کیا وہ شہنشاہ کہلاتا تھا اور بڑے بڑے حکمران اس کے خوف سے کانپتے تھے۔

تو وہ بادشاہ جن کی اپنے زمانہ میں بڑی ہیبت تھی جن کا نام سُن کر ہزاروں میل پر لوگ کانپ اٹھتے تھے اُن کا نام آج انتہائی لاپروائی کے ساتھ ایک معمولی اور بے حیثیت آدمی بھی لے لیتا ہے اور کئی تو ایسے ہیں جن کا نام بھی آج کوئی نہیں جانتا مگر وہ غریب بکریاں اور اونٹ چرانے والے صحابہ جنہوں نے غربت میں اپنی عمریں گزار دیں آج اُن کا نام آتا ہے تو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ کہے بغیر ایک مسلمان کا دل مطمئن نہیں ہوتا۔

حضرت ابو ہریرہؓ اپنے متعلق کہتے ہیں کہ مجھے سات سات وقت کا فاقہ ہو جاتا تھا اور

جب میں شدتِ ضُعف سے بیہوش ہو جاتا تھا تو لوگ میرے سر پر جُوتیاں مارنے لگ جاتے اور سمجھتے کہ مجھے مرگی کا دَورہ ہو گیا ہے۔ پھر حضرت ابوہریرہؓ کسی اعلیٰ خاندان میں سے نہ تھے، کوئی دولت مند نہ تھے، کوئی پڑھے لکھے نہ تھے۔ پھر ہمارا بھی ان سے کوئی رشتہ داری کا تعلق نہیں۔ نہ ملک کا تعلق ہے نا خاندان کا تعلق ہے نہ زبان کا تعلق ہے۔ دُنیوی لحاظ سے وہ نہایت ہی ادنیٰ حالت کے تھے مگر آج ہماری یہ حالت ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہے بغیر دل کو چین آتا ہی نہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جو حالت تھی وہ خود ان کے باپ کی شہادت سے ظاہر ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے باپ کا نام ابوقحافہ تھا جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو اُس وقت ابوقحافہ مکّہ میں تھے۔ کسی شخص نے وہاں جا کر ذکر کیا کہ ابوبکرؓ عرب کا بادشاہ ہو گیا ہے۔ ابوقحافہ مجلس میں بیٹھے تھے کہنے لگے کون سا ابوبکر؟ اس نے کہا وہی ابوبکر قریشی۔ وہ کہنے لگے کون سا قریشی؟ اس نے کہا وہی جو تمہارا بیٹا ہے اور کون۔ وہ کہنے لگے واہ ابوقحافہ کے بیٹے کو عرب اپنا بادشاہ مان لیں یہ کیسے ہو سکتا ہے، تُو بھی عجیب باتیں کرتا ہے۔ غرض ابوقحافہ کی یہ حالت تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے متعلق یہ مان ہی نہیں سکتے تھے کہ سارا عرب انہیں اپنا بادشاہ تسلیم کر لے گا مگر اسلام کی خدمت اور دین کے لئے قربانیاں کرنے کی وجہ سے آج حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جو عظمت حاصل ہے وہ کیا دُنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہوں کو بھی حاصل ہے؟ آج دنیا کے بادشاہوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں جسے اتنی عظمت حاصل ہو جتنی حضرت ابوبکرؓ کو حاصل ہے بلکہ حضرت ابوبکرؓ تو الگ رہے کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی اتنی عظمت حاصل نہیں جتنی مسلمانوں کے نزدیک حضرت ابوبکرؓ کے نوکروں کو حاصل ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ ہمیں حضرت ابوبکرؓ کا کتا بھی بڑی بڑی عزتوں والوں سے اچھا لگتا ہے۔ اس لئے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے در کا خادم ہو گیا۔ اس لئے کہ اس نے ہمارے رب کے دروازہ پر سجدہ کیا۔ جب اس نے ہمارے رب کے دروازے پر سجدہ کیا اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے در کا غلام ہو گیا تو اس کی ہر چیز ہمیں پیاری لگنے لگ گئی اور اب یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص اس عظمت کو ہمارے دلوں سے محو کر سکے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تاجر آدمی تھے اور تاجر کو لڑائی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ مال واسباب کی گٹھڑی اُٹھا کر اِردگرد کے دیہات میں چلے جاتے اور اسے فروخت کرتے۔

بیشک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دولت مند تھے مگر آپ کا خاندان کوئی بڑا خاندان نہیں تھا صرف ایک عام شریف قریشی خاندان تھا اور کام آپ کا تجارت تھا۔ مال واسباب اِرد گرد کے گاؤں میں لے جاتے اور پھیری کے طور پر بیچ دیتے اور چونکہ آپ ذہین اور ہوشیار تھے اس لئے اُن کی تجارت میں برکت تھی اور وہ کافی روپیہ کما لیتے تھے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام نصیب کیا تو اُس تاجر کے دل میں وہ جرأت اور بہادری پیدا ہوگئی جو بڑے بڑے فوجیوں کے دلوں میں بھی نہیں ہوتی۔

ایک دفعہ صحابہؓ کی مجلس میں کسی نے کہا کہ ابوبکرؓ لڑنے والے آدمی نہیں تھے۔ خبر نہیں جنگوں میں ان کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ اس پر ایک صحابی کہنے لگے ہم میں سے سب سے زیادہ بہادر وہ شخص سمجھا جاتا تھا جو جنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ اس لئے کہ دشمن کا سارا حملہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم نے ان کو مار دیا تو باقی مسلمانوں کی ہمتیں پَست ہو جائیں گی اور ان کو ختم کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں رہے گا اور ہمیشہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہرے پر حضرت ابوبکرؓ ہی کھڑے ہوتے تھے۔[8]

قربانی کا یہ حال تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک دفعہ ان کے بڑے بیٹے نے جو بعد میں مسلمان ہوئے اور جو بدر یا اُحد کی جنگ میں (مجھے صحیح یاد نہیں) کفار کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ ابا جان اُس جنگ میں جب فلاں جگہ سے آپ گزر رہے تھے تو میں ایک پتھر کے پیچھے چھُپ کر کھڑا تھا اور مَیں اگر چاہتا تو آپ کو مار دیتا مگر مَیں نے کہا باپ کو تو نہیں مارنا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ خدا نے تجھے ایمان نصیب کرنا تھا اس لئے تو بچ گیا۔ خدا کی قسم اگر میں تجھے دیکھ لیتا تو ضرور مار ڈالتا۔[9] جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے ہیں تو اُس وقت سارا عرب مرتد ہو گیا اور حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ جیسے بہادر انسان بھی اس فتنہ کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ وفات کے قریب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر رومی علاقہ پر حملہ کرنے کے لئے تیار کیا تھا اور اسامہؓ کو اس کا افسر مقرر کیا تھا مگر ابھی وہ لشکر روانہ نہیں ہوا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ آپ کی وفات پر جب قریباً سارا عرب مرتد ہو گیا تو صحابہ گھبرا گئے اور انہوں نے سوچا کہ اگر

ایسی بغاوت کے وقت اُسامہؓ کا لشکر بھی رومی علاقہ پر حملہ کرنے کے لئے بھیج دیا گیا تو پیچھے صرف بوڑھے، مرد، بچے اور عورتیں رہ جائیں گی اور مدینہ کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں ہو سکے گا۔ چنانچہ انہوں نے تجویز کی کہ اکابر صحابہؓ کا ایک وفد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جائے اور اُن سے درخواست کرے کہ اس لشکر کو بغاوت کے فرو ہونے تک روک لیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اور اکابر صحابہؓ مل کر ایک وفد کی صورت میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور اُن سے عرض کیا کہ کچھ عرصہ کے لئے اس لشکر کو روک لیا جائے۔ جب بغاوت فرو ہو جائے تو پھر بیشک اسے بھیج دیا جائے۔ جب حضرت ابوبکرؓ کے پاس یہ وفد پہنچا تو آپؓ نے نہایت غصہ سے اس وفد کو یہ جواب دیا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد ابوقحافہ کا بیٹا سب سے پہلا یہ کام کرے کہ جس لشکر کو روانہ کرنے کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حُکم دیا تھا اسے روک لے۔ (حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عادت تھی کہ جب وہ اپنی تحقیر کرنا چاہتے تو اپنے باپ کا نام لیتے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میری کیا حیثیت ہے کہ میں ایسا کروں۔ اس موقع پر بھی آپ نے اَپنے باپ کا نام لے کر کہا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ابوقحافہ کا بیٹا سب سے پہلا کام یہ کرے کہ جس لشکر کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ کرنے کے لئے تیار کیا تھا اسے وہ روک لے۔) پھر آپ نے فرمایا گھبرانے کی کوئی بات نہیں اگر سارا عرب باغی ہو گیا ہے تو بیشک ہو جائے، خدا کی قسم اگر دشمن کی فوج مدینہ میں گھس آئے اور ہمارے سامنے مسلمان عورتوں کی لاشیں کتے گھسیٹتے پھریں تب بھی میں اس لشکر کو ضرور روانہ کروں گا جس کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ کرنے کے لئے تیار کیا ہے۔ اگر تم دشمن کی فوجوں سے ڈرتے ہو تو بیشک میرا ساتھ چھوڑ دو میں اکیلا تمام دشمنوں کا مقابلہ کروں گا۔[10] یہ جرأت اور دلیری حضرت ابوبکرؓ میں کہاں سے پیدا ہوگئی؟ یہ وہی **اِرْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا** والے حکم کی تعمیل کا نتیجہ ہے جس طرح بجلی کے ساتھ معمولی تار بھی مل جاتی ہے تو اس تار میں عظیم الشان طاقت پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح جب کوئی شخص خدا تعالیٰ کا قُرب حاصل کر لیتا ہے تو دُنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بجلی سے علیحدہ کر لو تو تار کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی مگر اسی تار میں جب بجلی کی رَو آئی ہوئی ہو اور تار کے اوپر سے اتفاقاً ربڑ اُترا ہؤا ہو تو اگر ایک قوی سے قوی

پہلوان بھی اسے چھوئے گا تو مُردہ چوہے کی طرح گر جائے گا اور اس کی طاقت اسے کوئی نفع نہیں پہنچا سکے گی۔

تو دُنیوی عزتوں کے حصول کے لئے لوگ بڑی بڑی قُربانیاں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس موقع پر اسی امر کا ذکر کرتا اور فرماتا ہے کہ اے مومنو! جب تم ہمارے پاس آئے ہو تو تمہیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ بغیر **ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ** کے احکام پر عمل کرنے کے تمہیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہاں اگر تم اللہ تعالیٰ پر توکل کرو، ہمارے احکام کی فرمانبرداری کا عہد کرو اور ہماری عبادت میں لگ جاؤ تو ہم تمہیں کامیاب کر دیں گے مگر دُنیا ان باتوں پر عمل اپنے اوقات کا ضیاع سمجھتی ہے۔ وہ کہتی ہے ہم پانچ وقت کی نمازیں پڑھیں تو کیوں پڑھیں۔ اس سے ہمیں کوئی فائدہ تو نہیں ہوتا یونہی وقت ضائع ہوتا ہے اور اگر ہم پنجوقتہ نمازیں پڑھنے لگیں تو باقی کام کب کریں؟ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کی بات ہے یہاں ایک زمیندار آیا۔ اس کو کسی شخص نے کہا تھا کہ قادیان جا کر دیکھو اور مرزا صاحب کی زیارت کرو تب تمہیں وہاں کی قدر و منزلت معلوم ہوگی۔ مخالفوں کی باتوں پر اعتبار کرنا درست نہیں۔ چنانچہ وہ اس تحریک پر قادیان آیا جب وہ واپس گیا تو لوگوں نے اس سے پوچھا کہ سناؤ قادیان گئے تھے تم نے کیا دیکھا؟ وہ کہنے لگا واہ قادیان کی بڑی تعریفیں سُنی تھیں مَیں تو دیکھ آیا ہوں وہ تو آدمیوں کے رہنے کی جگہ ہی نہیں۔ لوگوں نے اُس سے پوچھا آخر بتاؤ تو سہی ہوا کیا؟ کہنے لگا کیا بتاؤں، وہ بھی کوئی جگہ ہے۔ جب مَیں وہاں یکّہ پر پہنچا تو نو دس بجے کا وقت تھا۔ مَیں نے چاہا کہ مہمان خانہ میں ذرا آرام کریں گے کہ کسی نے کہا چلو جی مولوی صاحب قرآن اور حدیث پڑھا رہے ہیں وہ سُنیں۔ مَیں نے کہا اچھا آرام پھر کریں گے۔ جب قادیان آئے ہیں تو قرآن اور حدیث سُن لیں چنانچہ مَیں وہاں گیا وہ مطب میں بیٹھے تھے، بڑی دیر بیماروں کو دیکھتے رہے، پھر اُنہوں نے قرآن پڑھایا، پھر حدیث پڑھائی اور اسی طرح اَور دینی باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ بارہ بج گئے وہاں سے واپس آئے تو مَیں نے کہا چلو اب آرام سے حُقّہ پیتے ہیں مگر ابھی حُقّہ تیار ہی کرنے لگا تھا کہ ایک آدمی آیا اور کہنے لگا چوہدری صاحب کھانا تیار ہے پہلے یہ کھا لیں۔ مَیں نے کہا اچھا کھانا کھا لیں پھر حُقّہ پی لیں گے۔

چنانچہ کھانا کھایا اور حُقّہ تیار کرنا شروع کیا مگر ابھی چلم سُلگی نہیں تھی کہ ظہر کی اذان ہوگئی اور ایک شخص مجھے کہنے لگا مسجد چلو وہاں مرزا صاحب آئیں گے ان کی زیارت کرنا۔ چنانچہ مَیں حُقّہ کو وہیں چھوڑ کر مسجد چلا گیا اور نماز پڑھی۔ نماز کے بعد مرزا صاحب وہیں بیٹھ گئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب وہ اُٹھ کر اندر گئے تو مَیں نے کہا چلو اب چل کر حُقّہ پئیں۔ چنانچہ مَیں نے پھر چلم سُلگائی اور حُقّہ تیار کیا مگر ابھی دو تین کش ہی لگائے تھے کہ عصر کی اذان ہوگئی۔ لوگ مجھے کہنے لگے کہ چلو عصر کی نماز پڑھو۔ مَیں حُقّہ کو وہیں چھوڑ کر عصر کی نماز پڑھنے چلا گیا۔ جب مَیں عصر کی نماز پڑھ چُکا تو مَیں سمجھا کہ اب مَیں جا کر آرام سے حُقّہ پیوؤں گا مگر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ لوگ کہنے لگے مولوی صاحب بڑی مسجد میں درس دینے چلے گئے ہیں، وہاں چلو۔ چنانچہ مَیں اُٹھ کر بڑی مسجد چلا گیا۔ وہاں شام تک درس ہوتا رہا۔ وہاں سے ابھی اُٹھا ہی تھا کہ مغرب کی اذان ہوگئی۔ چنانچہ مغرب کی نماز پڑھنے چلا گیا۔ مغرب کے بعد مرزا صاحب پھر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگ گئے۔ وہاں سے جب مَیں اُٹھا تو مَیں نے کہا اب تو چلم سُلگا کر آرام سے حُقّہ پیوؤں گا مگر ابھی چلم سُلگانے بھی نہیں پایا تھا کہ عشاء کی اذان ہوگئی مَیں عشاء پڑھنے چلا گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو کہنے لگے کھانا کھا لو۔ چنانچہ کھانا کھایا اور مَیں نے سمجھا کہ اب تو فراغت ہوئی مگر کھانا کھا کر مَیں فارغ ہی ہؤا تھا کہ ایک مولوی صاحب کا مہمان خانہ میں ہی درس شروع ہوگیا مَیں وہ سُننے لگ گیا اور سُنتے سُنتے ہی نیند آگئی اور اُٹھ کر سو گیا اور حُقّہ پینے کا موقع نہ مِلا۔ جب صبح آنکھ کھلی تو بستر اُٹھا کر مَیں وہاں سے نکل کھڑا ہؤا اور مَیں نے سمجھ لیا کہ یہ آدمیوں کے رہنے کی جگہ نہیں۔ تو دُنیا کے لوگ جو ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ نماز پڑھنی اور روزے رکھنے، دین کی خدمت کرنا سب وقت کا ضیاع ہے۔ چنانچہ کئی مسلمان ایسے ہیں جنہوں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ بھلا آج کل پانچ وقت نماز پڑھ کر بھی کوئی قوم ترقی کر سکتی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دُنیا کی کوئی قوم اس رنگ میں ترقی نہیں کر سکتی مگر جس نے خدا تعالیٰ کی مدد سے ترقی کرنی ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ پنجوقتہ نماز پڑھے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ روزے رکھے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدمت دین کرے خواہ دُنیا اسے وقت اور مال کا ضیاع ہی قرار دے۔ پس فرماتا ہے **وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ** تم اپنے رب کی عبادت کرو

وَافْعَلُوا الْخَيْرَ جب تم یہ باتیں کرلو یعنی جب اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔ جب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں پر اُٹھالو، جب تم اس کی شب و روز عبادت کرو تو پھر چوتھا فرض تمہارا یہ ہے کہ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ تم بنی نوع انسان کی بھلائی کی کوشش کرو، تم یتیموں کی خبر گیری کرو، تم بیواؤں کی نگہداشت کرو، تم مساکین سے شفقت اور رأفت کے ساتھ پیش آو، تم ہمسائیوں سے نیک سلوک کرو، تم دین اسلام کو ان لوگوں میں پھیلاؤ جو اسلامی تعلیم سے نا آشنا ہیں۔ غرض جس قدر اچھے کام ہیں وہ سب کرو لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ کو تو لوگ کسی حد تک مانتے ہیں مگر باقی جس قدر احکام ہیں ان کو دُنیا اپنی تباہی کی علامت سمجھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں جو توکّل کرے گا اس کا بیڑا غرق نہیں ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟ پھر وہ کہتے ہیں جو احکامِ مذہبی پر چلے گا اور دین کی ترقی کے لئے چندہ دے گا وہ غریب نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ اسی طرح وہ کہتے ہیں جو پانچ وقت نماز پڑھے گا وہ تین چار گھنٹہ ضرور ضائع کردے گا اور جس نے اپنے اوقات کا اتنا بڑا حصہ اس طرح رائیگاں کردیا وہ دُنیا میں کامیاب کس طرح ہوسکتا ہے؟ غرض دُنیا ان تمام باتوں کو تباہی کا مؤجب سمجھتی ہے مگر جن امور کو دُنیا تباہی کا مؤجب سمجھتی ہے قرآن کریم کہتا ہے کہ وہی تم کرو کیونکہ دُنیوی ترقی اور دینی ترقی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اِس کے ذرائع اَور ہوتے ہیں اور اُس کے ذرائع اور۔ ہماری جماعت بھی ایک دینی جماعت ہے اور ہماری ترقیات بھی دین سے ہی وابستہ ہیں دُنیوی ذرائع سے نہیں۔

مَیں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بارہا سُنا ہے آپ فرمایا کرتے تھے ہماری جماعت میں تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو میرے دعویٰ کو سمجھ کر اور سوچ کر احمدی ہوئے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میری بعثت کی کیا غرض ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ جس رنگ میں پہلے انبیاء کی جماعتوں نے قُربانیاں کی ہیں اسی رنگ میں ہمیں بھی قُربانیاں کرنی چاہئیں مگر ایک اَور جماعت ایسی ہے جو صرف حضرت مولوی نورالدین صاحب کی وجہ سے ہمارے سلسلہ میں داخل ہوئی ہے وہ اُن کے استاد تھے، انہیں معزز اور عقلمند سمجھتے تھے۔ انہوں نے کہا جب مولوی صاحب احمدی ہوگئے ہیں تو آؤ ہم بھی احمدی ہو جائیں۔ پس اُن کا تعلق ہمارے سلسلہ سے

مولوی صاحب کی وجہ سے ہے ۔سلسلہ کی غرض اور میری بعثت کی حکمت اور غایت کو انہوں نے نہیں سمجھا۔اس کے علاوہ ایک تیسری جماعت بعض نوجوانوں کی ہے جن کے دل میں گو مسلمانوں کا درد تھا مگر قومی طور پر نہ کہ مذہبی طور پر۔وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا کوئی جتھا ہو ان میں کچھ تنظیم ہو، ان میں انجمنیں قائم ہوں اور مدرسے جاری ہوں مگر چونکہ عام مسلمانوں کا کوئی جتھا بنانا ان کے لئے ناممکن تھا اس لئے جب انہوں نے ہماری طرف ایک جتھا دیکھا تو وہ ہم میں آگئے اور اب وہ چاہتے ہیں کہ مدرسے قائم کریں اور لوگ ڈگریاں حاصل کریں ۔اسی وجہ سے وہ ہمارے سلسلہ کو ایک انجمن سمجھتے ہیں، مذہب نہیں سمجھتے ۔تو دُنیا میں ترقیات کے جو ذرائع سمجھے جاتے ہیں وہ بالکل اَور ہیں اور دین میں جو ترقی کے ذرائع سمجھے جاتے ہیں وہ بالکل اَور ہیں ۔انجمنیں اَور طرح ترقی کرتی ہیں اور دین اور طرح۔ دین کی ترقی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اخلاق کی درستگی کی جائے، قُربانی اور ایثار کا مادہ پیدا کیا جائے ،نمازیں پڑھی جائیں روزے رکھے جائیں، اللہ تعالیٰ پر توکّل پیدا کیا جائے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد کیا جائے ۔اگر ہم یہ تمام باتیں کریں تو گو دُنیا کی نگاہوں میں ہم پاگل قرار پائیں گے مگر خدا تعالیٰ کی نگاہ میں ہم سے زیادہ عقلمند اور کوئی نہیں ہوگا۔قرآن کریم میں آتا ہے کہ مسلمان جب مالی قُربانیاں کرتے تو منافق کہا کرتے کہ یہ مسلمان تو احمق ہیں بس روپیہ برباد کئے چلے جا رہے ہیں۔انہیں کوئی ہوش نہیں کہ اپنے روپیہ کو کسی اچھے کام پر لگائیں ۔اسی طرح جب وہ اوقات کی قُربانی کرتے تو پھر وہ کہتے یہ تو پاگل ہیں، اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔انہوں نے ترقی خاک کرنی ہے ۔گویا مسلمانوں کو یا وہ احمق قرار دیتے یا ان کا نام مجنوں رکھتے ۔یہی دو نام اُنہوں نے مسلمانوں کے رکھے ہوئے تھے مگر دیکھو پھر وہی احمق اور مجنوں دُنیا کے عقلمندوں کے استاد قرار پائے ۔

پس ہماری جماعت جب تک وہی احمقانہ رویّہ اختیار نہیں کرے گی جس کو کافر اور منافق احمقانہ قرار دیتے تھے اور ہماری جماعت جب تک وہی مجنونانہ رویّہ اختیار نہیں کرے گی جس کو کافر اور منافق مجنونانہ رویّہ قرار دیتے تھے اس وقت تک اسے کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی ۔

اگر تم چاہو کہ تم ضرورت کے موقع پر جھوٹ بھی بول لیا کرو، اگر تم چاہو کہ تم ضرورت کے

موقع پر دھوکا فریب بھی کر لیا کرو، اگر تم چاہو کہ تم ضرورت کے موقع پر چالبازی سے بھی کام لیا کرو، اگر تم چاہو کہ تم ضرورت کے موقع پر غیبت اور چُغلی سے بھی کبھی کبھی فائدہ اُٹھا لیا کرو اور پھر یہ امید رکھو کہ تمہیں کامیابی حاصل ہو جائے تو یاد رکھو تمہیں ہرگز وہ کامیابی حاصل نہیں ہوگی جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا ہے۔ یہ چیزیں دُنیا کی انجمنوں میں بیشک کام آیا کرتی ہیں مگر دین میں ان کی وجہ سے برکت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی لعنت اُترا کرتی ہے۔

چند دن ہوئے ہمارے سلسلہ کے ایک آدمی نے کسی موقع پر مجھ سے ایک بات کا ذکر کیا جس سے مَیں یہ سمجھا کہ کسی اَور شخص کو جھوٹ بولنے کے لئے کہا گیا تھا۔ یہ سُن کر میری حیرت کی کوئی انتہاء نہ رہی کہ پچاس سال آج ہمارے سلسلہ کو قائم ہوئے ہو رہے ہیں اور پچاس سال سے یہ تعلیم ہماری جماعت کے کانوں میں ڈالی جا رہی ہیں کہ جھوٹ نہیں بولنا، جھوٹ نہیں بولنا۔ مگر باوجود اس کے میرے سامنے نہایت صفائی سے کہہ دیا گیا کہ فلاں احمدی سے اتنے جھوٹ کی اُمید کی گئی تھی مگر اس نے اتنا جھوٹ بھی نہ بولا۔ مجھے طبعاً اس پر غصہ آنا چاہئے تھا اور آیا۔ چنانچہ میں نے کہا احمدیت اور جھوٹ نہایت متضاد چیزیں ہیں۔ تم اس پر الزام لگاتے ہو اور کہتے ہو کہ اس نے جھوٹ کیوں نہ بولا۔ حالانکہ میرے نزدیک اس نے بہت بڑی نیکی کا کام کیا کہ باوجود تحریک کے اس نے جھوٹ نہ بولا۔ میرے اس کہنے پر وہ نہایت سادگی سے کہنے لگا اچھا اگر کوئی غیر احمدی جھوٹ بول دے؟ مَیں نے کہا اگر کوئی غیر احمدی ہمارے علم کے بغیر ہزار دفعہ بھی جھوٹ بولتا ہے تو بیشک بول دے لیکن اگر وہ ہمارے اشارہ سے جھوٹ بولتا ہے تو جھوٹ بولنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو لعنت اُترے گی وہ اُس پر پڑے گی اور ہم پر بھی پڑے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ پر توکل کوئی آسان نہیں بلکہ بہت بڑا مشکل کام ہے۔ یہ ایک موت ہے جو انسان کو قبول کرنی پڑتی ہے اور جب تک کوئی شخص موت قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو اس وقت تک اسے توکل کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک انسان کے لئے سہولت اور آرام کا زمانہ رہتا ہے وہ بڑے بڑے دعوے کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جھوٹ نہیں بولنا چاہئے، جھوٹ نہیں بولنا چاہئے۔ مگر جب کسی مصیبت میں مُبتلا ہوتا ہے تو جھوٹ بول لیتا ہے

کیونکہ گو وہ مانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بچا سکتا ہے مگر اسے اس بات پر یقین نہیں ہوتا کہ واقع میں اللہ تعالیٰ اسے بچا سکتا ہے۔ وہ صرف ایک بات پر عقیدہ رکھتا ہے۔ اس بارے میں اسے یقین حاصل نہیں ہوتا اور عقیدہ اَور چیز ہے اور یقین اَور چیز۔ عقیدہ ایک رسمی چیز ہوتا ہے مگر ایمان اور یقین ذاتی فعل ہیں یہ جو ماں باپ سے لوگ دین سیکھتے ہیں، یہ صرف عقیدہ ان سے لیتے ہیں، ایمان ان سے نہیں لیتے۔ ایمان ہر انسان کو خود حاصل کرنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی جائداد نہیں جو انسان کو اپنے ماں باپ سے ورثہ میں مل جائے۔ دولت ورثہ میں مل سکتی ہے، مکان ورثہ میں مل سکتا ہے، جائداد ورثہ میں مل سکتی ہے مگر ایمان ورثہ میں نہیں مل سکتا۔ ایمان ہر انسان کو خود کمانا پڑتا ہے چاہے ہزار پُشت سے کوئی مؤمن خاندان چلا آرہا ہو پھر بھی ہزارویں پُشت میں جو لڑکا ہوگا اس کو خود ایمان کمانا پڑے گا ورثہ میں اسے نہیں ملے گا۔ ورثہ میں اسے صرف عقیدہ ملے گا نہ کہ ایمان۔ ایک مسلمان کا بچہ عقیدۃً یہی کہے گا کہ خدا ایک ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سچے رسول ہیں مگر اسے ایمان نہیں کہا جائے گا۔ ایمان اُس میں تبھی پیدا ہوگا جب وہ اللہ تعالیٰ کی آیات پر غور کر کے اور اس کے نشانات پر تدبر کر کے یہ کہے گا کہ ہاں واقع میں اللہ ایک اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔

مَیں گیارہ سال کا تھا جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل سے یہ توفیق عطا فرمائی کہ مَیں اپنے عقیدہ کو ایمان سے بدل لوں۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا، مَیں اپنے مکان میں کھڑا تھا کہ یکدم مجھے خیال آیا۔ کیا مَیں اس لئے احمدی ہوں کہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ میرے باپ ہیں یا اس لئے احمدی ہوں کہ احمدیت سچی ہے اور یہ سلسلہ خدا تعالیٰ کا قائم کردہ ہے۔ یہ خیال آنے کے بعد مَیں نے فیصلہ کیا کہ مَیں اس بات پر غور کر کے یہاں سے ہٹوں گا اور اگر مجھے پتہ لگ گیا کہ احمدیت سچی نہیں تو مَیں اپنے کمرے میں داخل نہیں ہوں گا بلکہ یہیں صحن سے باہر نکل جاؤں گا۔ یہ فیصلہ کر کے مَیں نے غور کرنا شروع کیا اور قدرتی طور پر اس کے نتیجہ میں بعض دلائل میرے سامنے آئے جن پر مَیں نے جرح کی۔ کبھی ایک دلیل دوں اور اُسے توڑوں پھر دوسری دلیل دوں اور اسے ردّ کروں پھر تیسری دلیل دوں اور اسے توڑوں۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے یہ سوال میرے سامنے آیا کہ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے سچے رسول تھے؟ اور کیا

مَیں ان کو سچا مانتا ہوں کہ میرے ماں باپ کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ سچے ہیں؟ یا مَیں ان کو اس لئے سچا مانتا ہوں کہ مجھ پر دلائل و براہین کی رو سے یہ روشن ہو چکا ہے کہ واقع میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم راستباز رسول ہیں؟ جب یہ سوال میرے سامنے آیا تو میرے دل نے کہا کہ اب مَیں اس امر کا بھی فیصلہ کر کے ہٹوں گا۔ اس کے بعد قدرتی طور پر خدا تعالیٰ کے متعلق میرے دل میں سوال پیدا ہوا اور مَیں نے کہا یہ سوال بھی حل طلب ہے کہ آیا مَیں خدا تعالیٰ کو یونہی عقیدہ کے طور پر مانتا ہوں یا سچ مچ یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو چکی ہے کہ دُنیا کا ایک خدا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ کے سوال پر بھی مَیں نے غور کرنا شروع کیا اور میرے دل نے کہا اگر خدا ہے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے رسول ہیں اور اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے رسول ہیں اور اگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی سچے ہیں تو پھر احمدیت بھی یقیناً سچی ہے اور اگر دُنیا کا کوئی خدا نہیں تو پھر ان میں سے کوئی بھی سچا نہیں اور مَیں نے فیصلہ کر لیا کہ آج مَیں اس سوال کو حل کر کے رہوں گا اور اگر میرے دل نے یہی فیصلہ کیا کہ کوئی خدا نہیں تو پھر مَیں اپنے گھر میں نہیں رہوں گا بلکہ فوراً باہر نکل جاؤں گا۔

یہ فیصلہ کر کے مَیں نے سوچنا شروع کر دیا اور سوچتا چلا گیا۔ اپنی عمر کے لحاظ سے مَیں اس سوال کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا مگر پھر بھی مَیں غور کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میرا دماغ تھک گیا۔ اُس وقت میں نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اس دن بادل نہیں تھے۔ آسمان کا جَوّ نہایت ہی مصفّٰی تھا اور ستارے نہایت خوشنمائی کے ساتھ آسمان پر چمک رہے تھے۔ ایک تھکے ہوئے دماغ کے لئے اس سے زیادہ فرحت افزا اَور کونسا نظارہ ہو سکتا تھا۔ مَیں نے بھی ان ستاروں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ مَیں انہی ستاروں میں کھویا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب پھر میرے دماغ کو تروتازگی حاصل ہوئی تو مَیں نے اپنے دل میں کہا کیسے اچھے ستارے ہیں مگر ان ستاروں کے بعد کیا ہوگا؟ میرے دماغ نے اس کا یہ جواب دیا کہ ان کے بعد اَور ستارے ہوں گے۔ پھر مَیں نے کہا ان کے بعد کیا ہوگا؟ اس کا جواب بھی مجھے میرے دل نے یہی دیا کہ ان کے بعد اَور ستارے ہوں گے۔ پھر میرے دل نے کہا اچھا تو پھر ان کے بعد کیا ہو گا؟ میرے دماغ نے پھر یہی جواب دیا کہ اُن کے بعد اَور ستارے ہوں گے۔ مَیں نے کہا اچھا تو پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس کا بھی پھر وہی جواب میرے دل اور دماغ نے دیا کہ کچھ اَور

ستارے ہوں گے۔ تب میرے دل نے کہا کہ یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے اور تیسرے کے بعد چوتھے ستارے ہوں۔ کیا یہ سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوگا؟ اگر ختم ہوگا تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہی وہ سوال ہے جس کے متعلق اکثر لوگ حیران رہتے ہیں اور وہ کہتے ہیں ہم جو کہتے ہیں کہ خدا غیر محدود ہے اس کے کیا معنی ہیں؟ اور ہم جو کہتے ہیں خدا ابدی ہے اس کے کیا معنی ہیں؟ آخر کوئی نہ کوئی حدّ ہونی چاہئے۔ یہی سوال میرے دل میں ستاروں کے متعلق پیدا ہوا اور مَیں نے کہا آخر یہ کہیں ختم بھی ہوتے ہیں یا نہیں اور اگر ہوتے ہیں تو اس کے بعد کیا ہے اور اگر ختم نہیں ہوتے تو یہ کیا سلسلہ ہے جس کا کوئی انتہاء نہیں۔ جب میرا دماغ یہاں تک پہنچا تو مَیں نے کہا خدا کی ہستی کے متعلق محدود اور غیر محدود کا سوال بالکل لغو ہے۔ تم خدا تعالیٰ کو جانے دو، تم ان ستاروں کے متعلق کیا کہو گے۔ میری آنکھوں کے سامنے یہ پڑے ہیں اگر ہم ان کو محدود کہتے ہیں تو محدود وہ ہوتا ہے جس کے بعد دوسری چیز شروع ہو جائے۔ پس سوال یہ ہے کہ اگر یہ محدود ہیں تو ان کے بعد کیا ہے؟ اور پھر اگر وہ بھی محدود رہے تو اس کے بعد کیا ہے؟ اور اگر کہو کہ یہ غیر محدود ہیں تو اگر ستاروں کی غیر محدودیت کا انسان قائل ہوسکتا ہے تو خدا تعالیٰ کی غیر محدودیت کا کیوں قائل نہیں ہوسکتا۔ تب میرے دل نے کہا کہ ہاں واقع میں خدا موجود ہے کیونکہ اس نے قانونِ قدرت میں وہی اعتراض رکھ دیا ہے جو اس کی ذات پر پیدا ہوتا ہے اور اس نے بتا دیا ہے کہ تم مجھے غیر مرئی چیز سمجھ کر اگر یہ اعتراض کرتے ہو تو پھر وہ چیزیں جو تمہیں نظر آ رہی ہیں ان کے متعلق تمہارا کیا جواب ہے؟ جبکہ وہی اعتراض جو تم مجھ پر کرتے ہو ان پر بھی عائد ہوتا ہے اور تمہارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ تم خدا تعالیٰ کے متعلق تو بے تکلّفی سے یہ کہہ دو گے کہ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ غیر محدود ہے؟ مگر کیا یہ ستارے غیر محدود نہیں؟ اگر ہیں تو غیر محدود کی تمہیں سمجھ آ گئی اور اگر محدود ہیں تو پھر ان کے بعد کیا ہے؟ اور اس کے بعد کیا ہے؟ اگر تم سمجھتے ہو کہ فضائے آسمانی میں غیر محدود سیارے اور ستارے ہیں تو خدا تعالیٰ پر سے اعتراض دور ہوگیا اور اگر یہ محدود ہیں تو اس محدود کا مُحدِّد کون ہے؟ اور جب اس کا مُحدِّد خدا ہے تو خدا کا وجود ثابت ہوگیا۔ تب مَیں نے سمجھا کہ وہ اعتراض ہی غلط ہے جو خدا تعالیٰ کے متعلق کیا جاتا ہے اور مَیں نے یقین کیا کہ وہ

موجود ہے اور جب مجھے یہ یقین حاصل ہو گیا کہ وہ موجود ہے تو میں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی خدا کے رسول ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ ان کی اتباع کئے بغیر کوئی شخص نجات حاصل کر سکے اور جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر مجھے یقین پیدا ہوا تو مَیں نے کہا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی سچے ہیں اور یقیناً ہمارا سلسلہ خدا تعالیٰ کا قائم کردہ سلسلہ ہے۔ تب اس فیصلہ کے بعد گیارہ ساڑھے گیارہ بجے مَیں اپنے بستر پر لیٹا۔ تو ایمان انسان کو خود حاصل کرنا پڑتا ہے مگر عقیدہ انسان کو ورثہ میں بھی مل جاتا ہے لیکن عقیدہ نفع نہیں دیتا۔ اگر دیتا ہے تو ایمان ہی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کے جو لوگ اپنے بچوں کے اندر ایمان پیدا نہیں کرتے محض عقائد سکھا دینے پر اکتفا کرتے ہیں ان کی نسلوں میں سے دین آخر مٹ جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں چونکہ ان کو یہ رٹا دیا گیا ہے کہ خدا ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ اس لئے دین ان کے اندر داخل ہو گیا۔ حالانکہ یہ عقیدہ ہے جو وہ انہیں سکھاتے ہیں ایمان تب ہی پیدا ہو سکتا ہے جب وہ خود غور کریں اور اپنے طور پر فیصلہ کریں کہ واقع میں یہ باتیں صحیح ہیں۔ کئی لوگ میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے اپنی اولاد خدمتِ دین کے لئے وقف کر دی ہے۔ مَیں انہیں ہمیشہ یہی کہا کرتا ہوں کہ جَزَاكُمُ اللهُ آپ کو اس کا ثواب ہو گیا مگر اپنے آپ کو وقف کرنا بیٹے کا کام ہے باپ کا نہیں۔ باپ اگر کہہ بھی دے کہ مَیں اپنے بیٹے کی زندگی وقف کرتا ہوں مگر بیٹا یہ کہے کہ مَیں دُنیا کماؤں گا تو ہم ایسے وقف سے کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور اگر ایسے شخص کو زبردستی دین کے کام پر لگایا بھی جائے گا تو دین میں رخنہ پیدا ہونے کے سوا اَور کیا ہوگا۔ تو اگر کوئی شخص اپنے بچہ کے متعلق یہ کہے کہ مَیں اسے وقف کرتا ہوں تو مَیں اسے یہی کہا کرتا ہوں کہ جَزَاكَ اللهُ مگر وقف کا زمانہ اس کا اسی وقت سے شروع ہوگا جب یہ خود جوان ہو کر کہے گا کہ مَیں اپنی زندگی خدمتِ دین کے لئے وقف کرتا ہوں۔ تو ایمان اور ذاتی طور پر کسب کئے ہوئے یقین کے بغیر دُنیا میں کبھی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی ورنہ رسمی طور پر جو باتیں عقائد میں شامل ہوتی ہیں وہ انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا کرتیں۔

پس ہماری جماعت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر ایمان پیدا کرے اور ہمیشہ یہ امر مدِّنظر رکھے کہ اس نے اپنی اولادوں کے اندر یقین اور وثوق پیدا کرنا ہے۔ مگر مَیں دیکھتا ہوں

ہماری جماعت میں ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو عقائد بھی پوری طرح اپنی اولاد کو نہیں سکھاتے اور جب انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ اُن کے عقائد کیا ہیں تو انہوں نے دنیا میں کرنا کیا ہے؟ اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ عقیدہ خود اپنی ذات میں کوئی بڑی چیز نہیں مگر کم سے کم وہ ایک چھوٹا سہارا ضرور ہے اور ایمان کے حصول کا پہلا زینہ ہے تو دینی معاملات میں ترقیات ان ذرائع کو اختیار کئے بغیر نہیں ہوسکتیں جو اللہ تعالیٰ نے دینی ترقی کے لئے ضروری قرار دیئے ہیں مگر مجھے افسوس ہے کہ ابھی تک ہماری جماعت نے پورے طور پر اس نقطہ کو نہیں سمجھا۔ حالانکہ جب تک ہماری جماعت پورے طور پر اس امر پر قائم نہیں ہو جاتی کہ چاہے کچھ ہو جائے ہم نے جھوٹ نہیں بولنا، ہم نے دھوکا اور فریب سے کام نہیں لینا۔ ہم نے کامل طور پر خدا تعالیٰ پر توکل کرنا اور اسی کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنا ہے اس وقت تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ مَیں کئی سال سے جماعت کو اس امر کی طرف توجہ دلا رہا ہوں مگر مجھے افسوس ہے کہ ابھی تک ہماری جماعت میں بعض لوگ ایسے ہیں جو جھوٹ بولتے یا بلواتے ہیں۔ اگر ہماری جماعت جھوٹ کو ہی کلیۃً چھوڑ دے تو یہ ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی تبلیغ ہو کہ دُشمن سے دُشمن بھی ہمارے اخلاق کی فوقیت کو تسلیم کئے بغیر نہ رہے۔ اسی طرح فریب، دغا، منافقت یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو قوم کو لوگوں کی نظروں میں گرا دیتی ہیں لیکن اگر ہم قربانی اور ایثار سے کام لیں اور ہمارے اخلاق نہایت اعلیٰ درجہ کے ہوں تو یقیناً ہماری جماعت کی عظمت تمام لوگوں کے دلوں میں قائم ہو جائے کیونکہ سچی قربانی اور نیک اخلاق ہی ہیں جو کسی قوم کی عظمت کو دُنیا میں قائم کیا کرتے ہیں۔ ورنہ خالی منظّم ہونا اور ایک جماعت میں شامل ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ تو دُنیادار انجمنوں میں بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی منظّم ہوتی ہیں اور وہ بھی ایک جماعتی رنگ اپنے اندر رکھتی ہیں۔

پس روحانی سلسلہ کے قیام کی اصل غرض تنظیم نہیں ہوتی بلکہ اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ اس جماعت کے افراد سلسلہ کی تعلیم کے زیر اثر جھوٹ سے بچیں، فریب سے کام نہ لیں، دغا اور منافرت کو چھوڑ دیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اسی پر توکل کریں، اس کے احکام کی کامل اطاعت اور فرمانبرداری کریں اگر یہ باتیں لوگوں میں پیدا نہیں ہوتیں تو محض تنظیم اور نظام اور خلافت پر ایمان انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور نہ اس تنظیم کا وہ روحانی نتیجہ نکل سکتا ہے جو

نماز، روزہ اور دوسرے احکامِ شرعیہ کا روحانی نتیجہ ہے۔ روحانی نتیجہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب نظام کو خادم سمجھا جائے۔ دُنیا اور دین میں یہی فرق ہے کہ دُنیا کے لوگ نظام کو اصل چیز قرار دیتے ہیں اور دیندار لوگ نظام کو اصل چیز کے حصول کا ایک ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ چونکہ دُنیا خالص نظام سے مِل جاتی ہے اس لئے نظام ان کی نظروں میں بہت بھاری ہوتا ہے اور اس کی وقعت ان کے دلوں پر غالب ہوتی ہے لیکن روحانی انعامات محض نظام کی وجہ سے حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ ان انعامات کے حصول کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ انسان اُن روحانی ہتھیاروں کو استعمال کرے جو خدا تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں۔

مَیں جماعت کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب وہ زمانہ آ گیا ہے جب اسے اپنی نیند چھوڑ دینی چاہئے اور غفلت اور سُستی کو ترک کر کے پوری ہوشیاری اور بیداری سے کام کرنا چاہئے کیونکہ دُنیا میں پھر تباہی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ لوگ پھر لڑنے کے لئے آمادہ ہو رہے ہیں۔ حکومتیں پھر جنگوں کے میدان میں کُودنے کے لئے تیار ہو رہی ہیں اور ہم جن کے لئے خدا تعالیٰ یہ تمام میدان صاف کر رہا ہے اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کر رہے۔ اگر دُنیا میں اب دوبارہ کوئی جنگ چھڑ گئی تو اس کے نتائج بنی نوع انسان کے لئے نہایت ہی خطرناک ہوں گے۔ تباہی کے سامان جو آج پیدا ہیں پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ بیشک آج کل بھی بعض جنگیں ہو رہی ہیں اور لوگ ان پر قیاس کرتے ہوئے مطمئن ہیں اور کہتے ہیں کہ ان جنگوں سے تو کوئی زیادہ تباہی نہیں ہوتی لیکن زیادہ تباہی نہ ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ابھی تک حکومتیں اپنے سامانِ حرب کو چھپائے ہوئے ہیں۔ اگر آج وہ اپنے تمام سامانوں کو ظاہر کر دیں تو ان کے دُشمن اس کوشش میں لگ جائیں کہ ان کا کیا علاج ہے۔ مثلاً اگر سپین کی جنگ میں ہی اٹلی اور جرمن والے اپنے تمام ہتھیار ظاہر کر دیتے تو دوسری قومیں یکدم سپین کے معاملہ میں دخل دے دیتیں اور کہتیں کہ اتنا ظلم مت کرو اور ان کے مُوجد اس بات میں مشغول ہو جاتے تا کہ ان ہتھیاروں کے مقابلہ میں انہیں کون سے ہتھیار تیار کرنے چاہئیں اور اس طرح اصل جنگ سے سال دو سال پہلے وہ ان کا توڑ تجویز کر لیتے یا مثلاً فرانسیسیوں نے تباہی کی جو جو چیزیں ایجاد کی ہوئی ہیں اگر وہ معمولی معمولی جنگوں میں ان کو ظاہر کر دیں تو دُشمن ضرور ہوشیار ہو جائے اور وہ ان کا علاج

سوچنے میں مشغول ہو جائے یا انگریز اگر ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں پر جو سرحد میں لڑی جاتی ہیں اپنے تمام ہتھیاروں کو ظاہر کر دیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلے کہ سب دُنیا کو معلوم ہو جائے کہ انگریزوں نے کون کون سی تباہی برپا کرنے والی چیزیں ایجاد کی ہوئی ہیں اور اس طرح انگریزوں کے دُشمن ان کا علاج سوچنے میں مصروف ہو جائیں۔ پس تباہی کے سامان تو نکلے ہوتے ہیں مگر اس وقت حکومتیں ان سامانوں کو چھپائے ہوئے ہیں اور وہ چاہتی ہیں کہ وہ ان سامانوں کو اسی دن ظاہر کریں جس دن ایک بڑی جنگ شروع ہو جائے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے ایسے خطرناک سامان تیار ہو چکے ہیں کہ ان کا خیال کر کے ہی انسان کانپ اُٹھتا ہے۔ ایبے سینیا میں ایک جگہ اٹلی والوں نے ذراسی اس کی نمائش کی تھی اور مَسٹرڈ گیس (MUSTARD GAS) ایبے سینیا کی فوج پر پھینکی تھی۔ اس وقت اٹلی کی فوج ایبے سینیا کی فوج سے شکست کھا رہی تھی مگر مسٹرڈ گیس پھینک کر انہوں نے جنگ کی کایا پلٹ دی۔ ہمارا ایک احمدی ڈاکٹر ان دنوں وہیں موجود تھا۔ اُس نے وہاں کے چشم دید حالات لکھ کر بھیجے تھے جنہیں پڑھ کر دل رحم سے بھر جاتا تھا۔ جس وقت ایبے سینیا کی فوج غلبہ کے خیال میں مست ہو کر آگے کی طرف بڑھتی چلی جارہی تھی یکدم اٹلی والوں نے مَسٹرڈ گیس پھینکنی شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ لوگ پاگلوں کی طرف ادھر اُدھر بھاگنے لگ گئے۔ خود ایبے سینیا کا بادشاہ بھی پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا تھا اور اس کا تمام جسم چھالے چھالے ہو گیا۔ مَسٹرڈ گیس ایک نہایت ہی زہریلی گیس ہوتی ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔ ابھی اور کتنی زہریلی گیسیں ہیں جو ان لوگوں نے تیار کر رکھی ہیں۔ کتابوں میں تو اس گیس کے متعلق مَیں نے پڑھا ہی تھا۔ تھوڑے دن ہوئے ایک دوست نے جنہیں اس گیس کا اچھی طرح علم تھا سُنایا کہ یہ گیس اس قسم کی ہوتی ہے کہ اس کے گرتے وقت یہ پتہ ہی نہیں لگتا کہ گیس گر رہی ہے مگر جسم کے اندر معاً گُھس جاتی ہے، تمام بدن پر چھالے پڑ جاتے ہیں، کھانسی ہو جاتی ہے، سینہ میں زخم پڑ جاتے ہیں اور انسان کے اندر آگ بھی لگ جاتی ہے۔ ایک ایک فٹ کی موٹی چھت بھی اگر ہو تو یہ گیس اس کے اندر گُھس جاتی ہے اور چھت پھاڑ کر اندر آ جاتی ہے اور اس سے بچنے کا سوائے اس کے اور کوئی ذریعہ نہیں کہ انسان اپنے تمام جسم پر ربڑ لپیٹ لے اور چونکہ یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اِس وقت گیس گر رہی ہے یا نہیں اس لئے اس کا علم

اُسی وقت ہوتا ہے جب انسان اس گیس کے زہریلے اثر کے نتیجہ میں مرنے لگتا ہے۔ پھر یہ گیس سیّال ہے اُڑتی نہیں۔ اگر کسی کمرے میں پڑی ہو تو بعض دفعہ سال سال پڑی رہتی ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ کمرہ بالکل صاف ہے اور سمجھتا ہے کہ پچھلے سال دُشمن نے اس علاقہ میں یہ گیس پھینکی تھی اب وہ گیس کہاں باقی ہے مگر جونہی وہ اس کمرہ میں داخل ہوتا ہے اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گڑھوں اور تالابوں میں یہ گیس ایک مدت دراز تک پڑی رہتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس علاقہ میں مَسٹرڈ گیس نہیں مگر اتفاقاً جب اس گڑھے سے کوئی جانور پانی پینے لگتا ہے یا انسان اس میں گھستا ہے تو گیس اس پر اپنا اثر پیدا کر کے اسے پاگل بنا دیتی اور بِالآخر ہلاک کر دیتی ہے۔ غرض یہ ایک نہایت ہی خطرناک گیس ہے۔ اگر یہی گیس ہوائی جہاز سپرے (Spray) کرتے چلے جائیں تو ملکوں کے مُلک وہ اسی ایک گیس سے تباہ کر سکتے ہیں اور کوئی اس کا علاج نہیں کر سکتا۔ گاؤں والے گھروں میں آرام سے بیٹھے ہوں اور ہوائی جہاز ان کے اوپر سے اس گیس کو سپرے کرتے چلے جائیں تو آدمی اور جانور سب کھانس کھانس کر مَر جائیں گے اور ان کے جسم پر آبلے ہی آبلے اُٹھ آئیں گے۔

اسی طرح ایسی شعاعیں ایجاد ہوئی ہیں جن کی مدد سے دور بیٹھے ہی ہوائی جہازوں اور توپوں کو چلایا جا سکتا ہے۔ ایسی شعاعیں ایجاد ہوئی ہیں جن کو پھینک کر دور بیٹھے ہی انسان ہوائی جہازوں کو گرا سکتا ہے۔ ایسے ایسے گولے نکلے ہیں جنہیں اگر ہوائی جہازوں کے ذریعہ شہروں اور دیہات پر گرا دیا جائے اور ان کے کنوؤں میں انہیں پھینک دیا جائے تو یکدم ٹائیفائیڈ اور ہیضہ تمام ملک میں پھیل جائے۔ غرض ایسی ایسی خطرناک تباہی کے سامان ایجاد ہو چکے ہیں کہ جس وقت بڑی قوموں میں لڑائی شروع ہوئی اس وقت لاکھوں بلکہ کروڑوں آدمیوں کا ایک ایک دن میں مَر جانا کوئی بڑی بات نہیں ہوگی بلکہ انہی سامانوں سے اگر کوئی حکومت چاہے تو سارے ہندوستان کا دو تین دن میں صفایا کر سکتی ہے۔ اس قدر خطرناک سامانوں کی موجودگی کیا تعجب ہے کہ ہماری ان دعاؤں کا ہی نتیجہ ہو جو ہم نے گزشتہ سالوں میں اللہ تعالیٰ کے حضور کیں مگر سوال یہ ہے کہ اس تباہی کے نتیجہ میں اسلام کی شوکت اور عظمت کے جو سامان پیدا ہوں گے ان سے فائدہ اُٹھانے کی ہم کیا کوششیں کر رہے ہیں۔ میرے سامنے اِس وقت دو تین ہزار

مرد اور عورت بیٹھے ہیں۔ مرد میرے سامنے ہیں اور عورتیں پردہ کے پیچھے۔ تم میں سے کتنے ہی ہیں جنہیں جب کہا جاتا ہے کہ تبلیغ کرو تو وہ آگے سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ تم مجھے بتاؤ کہ صحابہؓ میں سے کتنے تعلیم یافتہ تھے۔ سارے مکّہ میں صرف سات پڑھے لکھے شخص تھے مگر اب جو دین نظر آرہا ہے یہ انہی اَن پڑھوں کی کوششوں اور مساعی کا نتیجہ ہے اوروں کو جانے دو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خود اَن پڑھ تھے پھر تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ چونکہ ہم اَن پڑھ ہیں اس لئے دین کو سمجھنے اور اس کو پھیلانے کی طرف توجہ نہیں کر سکتے۔

پھر مَیں باہر کی جماعتوں سے بھی کہتا ہوں کہ وہ مجھے جواب دیں کہ وہ کیا قربانیاں کر رہے ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں سہارا دینا پڑتا ہے مثلاً چندے کا سوال آئے گا تو ایک دفعہ تو چندہ دیں گے مگر پھر دو تین سال بالکل خاموش رہیں گے اور دو تین سال گزرنے کے بعد ہمارے پاس آ کر کہیں گے میری توبہ میری توبہ۔ گزشتہ بقایا مجھے معاف کیا جائے آئندہ مَیں باقاعدہ چندہ دیا کروں گا۔ پھر انہیں بقایا معاف کر دیا جاتا ہے تو ایک دفعہ چندہ دے دیں گے اور پھر تین چار سال تک کچھ نہیں دیں گے اور جب ان پر اسی طرح تین چار سال اور گزر جائیں گے تو پھر ہمارے پاس آجائیں گے اور کہیں گے میری توبہ میری توبہ۔ مَیں بڑا جاہل تھا بڑا بیوقوف تھا، بڑا احمق تھا۔ مَیں نے اتنے عرصہ تک کوئی چندہ نہ دیا۔ اب خدا کے لئے مجھے پچھلا چندہ معاف کیا جائے۔ آئندہ انشاء اللہ اس میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ پھر ہم انہیں معاف کرتے ہیں تو وہ پھر غافل اور سُست ہو جاتے ہیں۔ یہی نمازوں کا حال ہے۔ کچھ دن درد سے نمازیں پڑھیں گے مگر پھر ان میں سُستی پیدا ہو جائے گی اور بعض تو بالکل نماز ترک کر بیٹھیں گے اور بعض جو پڑھیں گے وہ چٹّی سمجھ کر پڑھیں گے۔ یہی سچ کا حال ہے۔ خطبہ سُنیں گے تو کہیں گے لو جی اب ہم ہمیشہ سچ بولیں گے اور کبھی جھوٹ کے قریب بھی نہیں جائیں گے چنانچہ اس کے مطابق وہ دو تین دن سچ کا چوغہ پہن کر پھرتے رہیں گے مگر اس کے بعد وہ سچ کا چوغہ اُتار کر بکس میں بند کر کے رکھ دیں گے۔ گویا وہ ڈرتے ہیں کہ یہ اچھا لباس کہیں پہن پہن کر خراب ہی نہ ہو جائے۔

تو دین کے معاملہ میں استقلال جو کامیابی کی ایک بھاری شرط ہے وہ جماعت میں مفقود

ہے اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہ ۔ پھر ایک اور طبقہ ہے جو افیم کھائے ہوئے مریض کی طرح ہے جسے ہر وقت جگانا پڑتا ہے۔تحریک جدید کا کام عارضی اور مجموعی ہے مگر اس میں بھی سُستی پیدا ہوگئی ہے۔مَیں نے اس تحریک کے ابتداء میں یہ شرط کر دی تھی کہ اس میں وہی شخص حصّہ لے جو اپنی خوشی اور مرضی سے اس میں شامل ہونا چاہے۔کسی پر اس کے متعلق جبر نہیں کیا گیا مگر میں دیکھتا ہوں تین سال تو دوستوں کا جوش قائم رہا مگر اب چوتھے سال اس میں بھی کمزوری نظر آ رہی ہے۔حالانکہ اس سال تیسرے سال سے کم چندہ دوستوں کے ذمہ لگایا گیا ہے مگر پھر بھی پچپن ہزار کے قریب روپیہ ابھی وصول ہونا باقی ہے۔گویا ساٹھ فیصدی چندہ تو وصول ہوا ہے مگر چالیس فیصدی چندہ ابھی وصول ہونا باقی ہے۔ یہ امر بتا رہا ہے کہ باوجود اس کے کہ لوگوں نے طوعی طور پر اس چندہ میں شرکت کی تھی اور باوجود اس کے کہ ان پر کوئی جبر نہیں کیا گیا پھر بھی وہ ایسے تھے جن کے بدن میں اپنے قول کو پورا کرنے کی ہمت نہیں تھی ۔ گویا ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہتے ہیں سوگز واروں دس گز نہ پھاڑوں یعنی جب نام لکھانا پڑے تو اس وقت کہہ دیا کہ میں سَو گز کپڑا قربان کردوں گا مگر جب دینا پڑے تو ایک گز بھی نہیں دیتے حالانکہ تین سال یا سات سال انسانی عمر کے مقابلہ میں چیز ہی کیا ہیں۔معمولی معمولی بنّوں پر زمیندار آپس میں لڑ پڑتے اور دس دس سال کی قید کاٹ کر آ جاتے ہیں۔ پس اگر زمیندار ایک کھیت کی منڈیر پر دس سال کی قید بخوشی برداشت کر لیتے ہیں اور وہ ان سالوں کو کوئی بڑی بات نہیں سمجھتے تو خدا تعالیٰ کے دین کے لئے دس سال قربانی کرنا کون سی بڑی بات ہے۔ بالخصوص جب کہ مَیں نے بارہا کہہ دیا ہے کہ یہ طوعی قربانی ہے اور اس میں وہی حصّہ لے جو اس کی ادائیگی کا اپنی خوشی سے اقرار کرے۔ یہ کوئی جبری سکیم نہیں کہ ہر شخص کو ہم اس میں حصّہ لینے پر مجبور کریں۔ہم نے صاف کہہ دیا تھا کہ جس میں اسے برداشت کرنے کی ہمت نہیں وہ مت آئے۔صرف وہی آگے بڑھے جو اپنی مرضی سے اس میں حصّہ لے مگر افسوس ہے کہ اس میں بھی سُستی آ گئی۔مَیں نے اس کے لئے سیکرٹری بھی مقرر کئے تھے مگر وہ بھی افیمی طرز کے سیکرٹری معلوم ہوتے ہیں کہ سیکرٹری تو بن گئے ہیں مگر کام کی طرف ان کی کوئی توجہ نہیں ۔ یہی حال دوسرے کاموں کا ہے۔حالانکہ اب دُنیا پر ایک ایسا نازک وقت آ چُکا ہے کہ دُنیا میں عنقریب بہت بڑا تغیّر ہونے والا ہے۔تین سال

ہوئے مَیں نے کہا تھا کہ دس سال کے اندر دُنیا میں ایک عظیم الشان تغیّر پیدا ہوگا اور ابھی میری اس بات پر صرف تین سال گزرے ہیں کہ اس تغیّر کی علامتیں ظاہر ہونی شروع ہوگئی ہیں۔اب اگر دُنیا میں لڑائی شروع ہوئی تو یقیناً سمجھ لو کہ اس لڑائی کے بعد کی دُنیا وہ دُنیا نہیں ہوگی جو اب ہے بلکہ بالکل بدلی ہوئی دُنیا ہوگی۔ ہزاروں ایجادیں ممکن ہے دُنیا سے مِٹ جائیں کیونکہ ان ایجادات کے موجد دُنیا سے مٹ جائیں گے۔ ہزاروں کارخانے ممکن ہے دُنیا سے مِٹ جائیں کیونکہ ان کارخانوں کو چلانے والے دُنیا سے مِٹ جائیں گے۔ دُنیا کے سامنے ایک ایسی خطرناک تباہی نظر آ رہی ہے جو قیامت کا نمونہ ہوگی نہ انفلوائنزا اس تباہی کا مقابلہ کرسکتا ہے، نہ طاعون اس تباہی کا مقابلہ کرسکتی ہے، نہ گزشتہ جنگِ عظیم اس تباہی کا مقابلہ کرسکتی ہے کیونکہ طاعون اور انفلوائنزا ایک ایک آدمی کو پکڑتے ہیں مگر اس جنگ کے ذریعہ ایک کو نہیں بلکہ شہروں کے شہروں کو یکدم برباد کیا جاسکتا ہے۔ بالکل ممکن ہے وہ بڑے بڑے شہر جن میں تیس تیس، چالیس چالیس لاکھ کی آبادی ہے، ایک دن آدمیوں سے بھرے ہوئے ہوں مگر دوسرے دن تمہیں یہ اطلاع ملے کہ اس شہر میں ایک آدمی بھی باقی نہیں رہا سب مار دیئے گئے ہیں۔ گویا ملکُ الموت کی حکومت دنیا میں ہونے والی ہے اور خدا اُسے کھلی ڈھیل دینے والا ہے۔ دُنیا کے بعید ترین علاقوں کے لوگ بھی اس تباہی سے محفوظ نہیں۔تم خیال کرتے ہو کہ ہم ہندوستان کے رہنے والے ان حملوں سے محفوظ ہیں مگر یہ درست نہیں۔ دودو، تین تین ہزار میل کی پرواز کرنے والے ہوائی جہاز ایجاد ہوچکے ہیں۔اٹلی اور ایبے سینیا سے ہوائی جہاز آ کر پنجاب اور سندھ پر گولہ باری کرسکتے ہیں اور جاپان کے ہوائی جہاز چین کے راستوں سے آ کر مدراس، بنگال اور برما کو تباہ کرسکتے ہیں۔ پس مت سمجھو کہ تم محفوظ جگہوں میں ہو۔ اِس وقت ایسی زبردست تباہی کے سامان پیدا ہوچکے ہیں کہ کسی انسان کی زندگی بھی محفوظ نہیں۔ جب انسانی زندگی کے خون کی اس قدر اَرزانی ہو رہی ہے اور جب زندگی کا کوئی اعتبار ہی نہیں رہا تو کیوں نہ اس زندگی کو خدا تعالیٰ کے دین کے لئے خرچ کیا جائے۔اگر آج تم اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کروگے تو کل والی دُنیا کو خدا تمہارے سپرد کردے گا لیکن اگر آج تم نے اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کی تو نہ معلوم تمہاری جگہ کل خدا تعالیٰ کس قوم کو کھڑا کردے گا جو ان سامانوں سے فائدہ اُٹھائے گی جو

خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے پیدا کئے تھے۔ بیشک خدا تعالیٰ کے کام ہو کر رہیں گے اور کوئی نہیں جو انہیں روک سکے مگر کیسا بدقسمت ہے وہ شخص جس کی خدا تعالیٰ دعوت کرے مگر کوئی اور اس کو آ کر کھا جائے اور وہ اس سے محروم رہے۔ پس اپنے اندر تبدیلی پیدا کرو اور اس کے لئے ایثار اور قربانی کر کے اِرْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ کے مقام پر کھڑے ہو جاؤ اور وَافْعَلُوا الْخَيْرَ کا جامہ پہن لو لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ مگر یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک تم اپنی پہلی زندگی پر ایک موت وارد نہ کرو۔ پس اپنے اخلاق میں انتہاء درجہ کی تبدیلی پیدا کرو، اپنے افکار میں انتہاء درجہ کی تبدیلی پیدا کرو، اپنے اموال کی انتہاء درجہ کی قُربانی کرو، اپنے اوقات کی انتہاء درجہ کی قُربانی کرو تب تم یقیناً اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کر سکو گے۔ باتیں تو مَیں بتا سکتا ہوں مگر عمل کرنا تمہارا کام ہے۔ خدا تعالیٰ نے مجھے قرآن سمجھایا ہے اور مَیں وہ تمہیں سُنا دیتا ہوں مگر یہ میرے بس کی بات نہیں کہ مَیں ان باتوں پر تم سے عمل بھی کروالوں۔ یہ خدا نے تمہارے اختیار میں رکھا ہے کہ تم ان باتوں سے فائدہ اُٹھاؤ۔ اگر تم ان باتوں سے فائدہ اُٹھاؤ گے تو خدا تعالیٰ تمہارے لئے ترقیات کے سامان پیدا کر دے گا اور وہ تم پر رحم کرے گا اور اگر تم ان باتوں پر عمل نہیں کرو گے تو باقی دنیا پر اگر ایک جُرم ثابت کیا جائے گا تو تم پر دو جرم ثابت کئے جائیں گے لیکن اس کے مقابلہ میں اگر تم عمل کرو گے تو خدا تعالیٰ کے فضل کے دروازے بھی تم پر دوہرے طور پر کھولے جائیں گے۔ بعد میں جو لوگ آئیں گے انہیں ایک ثواب ملے گا مگر تمہیں دوہرا ثواب ملے گا کیونکہ وہ اس وقت آئیں گے جب دین ترقی کر چکا ہوگا اور تم اِس وقت دین کی خدمت کر رہے ہو جب ہزاروں گالیاں تمہیں دُشمنوں کی طرف سے سُننی پڑتی ہیں۔ پس تمہارے لئے برکتوں کے دروازے بھی کھلے ہیں اور لعنتوں کے دروازے بھی کھلے ہیں۔ تمہارے سامنے تریاق کا پیالہ بھی پڑا ہے اور تمہارے سامنے زہر کا پیالہ بھی پڑا ہے۔ اگر تم چاہتے ہو تو قُربانیوں کے میدان میں اپنا قدم آگے سے آگے بڑھا کر تریاق کے پیالہ کو پی جاؤ اور ابدی زندگی کے وارث بن جاؤ اور اگر چاہتے ہو تو زہر کا پیالہ پی کر اس کی ابدی لعنت اور عذاب کے مورد بن جاؤ اور اس کی برکتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاؤ۔ پس یہ تمہارے اپنے اختیار کی بات ہے اس میں نہ مَیں تمہاری مدد کرسکتا ہوں اور نہ کوئی

اَور مدد کرسکتا ہے۔ خدا بیشک مدد کرسکتا ہے مگر وہ کرتا نہیں اس کا فیصلہ یہی ہے کہ بندہ خود اپنا راستہ چُنے۔ پھر جس راستہ کو وہ چُن لیتا ہے اس کے مطابق اللہ تعالیٰ اس سے سلوک کرتا ہے۔''

(الفضل ۲۷؍ستمبر ۱۹۳۸ء)

۱؎ الحج:۷۸، ۷۹

۲؎ ترمذی ابواب صفة جهنم باب ماجاء ان ...... نفسين

۳؎ التوبة:۱۰۰

۴؎ کتاب البریہ صفحہ ۱۷۰ حاشیہ

۵؎ نیا تذکرۃ الاولیاء از رئیس احمد جعفری صفحہ ۳۵

۶؎ دارا: اصل نام دار یوس۔ ایران کا عظیم شہنشاہ اور فاتح۔ دورِ حکومت ۴۸۶ تا ۵۲۱ ق م۔

۷؎ ترمذی ابواب الزهد باب ماجاء في اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم و ابواب شمائل ترمذی باب ماجاء في عيش النبي صلى الله عليه وسلم

۸؎ تاریخ الخلفاء للسیوطی صفحہ ۸

۹؎ مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۴۷۵ مطبوعہ بیروت ۱۹۷۸ء

۱۰؎ تاریخ الخلفاء للسیوطی صفحہ ۵۱ مطبوعہ لاہور ۱۸۹۲ء